بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پاکستان کا دوسرا اور دنیا کا پانچ سو پچپنواں (۵۵۵) ریفرنڈم ۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ء کو بخیر و خوبی منعقد ہوا اور خدا کا شکر ہے کہ عوام واضح مثبت نتیجے پر پہنچے۔

جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو تو ہر جانب سے مبارکبادیں پہنچ رہی ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اصل مبارک خود پاکستان کے لیے ہے جس کی فلاح و بہبود کی راہ کھلی۔ بعد ازاں تہنیت اس کے شہریوں کے لیے ہے جنہوں نے ۱۹۴۶ء والے جذبے کی یاد تازہ کرا دی[1]۔

---

[1] میں اپنے ان قریبی ہمسفرانِ مقصد سے بے حد متاثر ہوں جنہوں نے اجتماعیت کے فیصلے کے مقابلے میں ذاتی آرا و جذبات کو درکنار رکھ کر نہ صرف ریفرنڈم میں ووٹ دیئے بلکہ تگ و دو بھی کی۔ نظامِ سمع و طاعت کے پابند یہی لوگ ہمارا اصل سرمایہ ہیں۔ اور انہی پر خدا کے بعد بھروسہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ راہِ حق میں ہماری قوت ہیں۔ میں آخرت میں بھی ان کے حق میں گواہی دوں گا کہ انہوں نے اجتماعیت کے احترام اور سربراہ کی اطاعت کا حق ادا کر دیا۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ ان کو دنیا و آخرت میں بہترین جزا دے اور شہدائے حق کی صف میں شامل کرلے۔ جس کسی سے کوتاہی ہوئی ہو وہ خدا سے بلجاجت عفو طلبی کرے۔ اجتماعیت سے انحراف اور سربراہ کی اطاعت سے روگردانی شرعی طور پر گناہ ہے۔

مجھے ریفرنڈم کے اعلان پر چند پہلوؤں سے اُلجھن رہی، مثلاً یہ ریفرنڈم ہونا چاہیے تھا یا نہیں؟ اب ہونا چاہیے تھا یا اب سے بہت پہلے؟ اس کے سوال کا انداز کیا ہونا چاہیے تھا؟ آیا نظریہ پاکستان اور حکومت کے نفاذِ اسلام، قوانین کو کتاب و سنت میں ڈھالنے کی مساعی و اقدامات کے متعلق الگ اور جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی ۵ سالہ صدارت کے لیے الگ، دو ریفرنڈم ہونے چاہئیں تھے؟ وغیرہ!

مگر احباب سے تبادلۂ خیالات کرنے اور ان کے دلائل سامنے آنے کے بعد، نیز ریفرنڈم کے سوال کا قانونی تجزیہ ہونے کے بعد ذہن آہستہ آہستہ یکسو ہو گیا اور پھر جب ہمسفرانِ جادۂ حق کا اجتماعی زاویۂ نگاہ نتھر کر سامنے آگیا تو چمکتے ہوئے چہروں نے مجھے بھی اطمینان کی روشنی دی۔ دِل ٹھک گیا کہ اس ریفرنڈم کو مثبت طور پر کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہیے۔ اور ہم سب کو اس میں امکانی حد تک ہر جائز طریقہ سے حصّہ لینا چاہیے۔ الحمدللہ کہ میرا دل احباب کے کاروان کے لیے اور میر کارواں کے لیے وفادار ہے۔ مَیں نے اپنی اہلیہ اور بیٹے سمیت ۵، ۶ میل کی دُوری پر جاکر اپنے ووٹ ڈلوائے اور دلی مسرت ہوئی کہ میں نے اپنا فرض خلوص سے ادا کیا۔ مجھے افسوس ہے اِس بات کا کہ علالت و ناتوانی کی وجہ سے مزید سرگرمی جو میدانِ عمل میں دکھائی جانی چاہیے، اس میں کوتاہ رہا۔ خدا اس کوتاہی کو معاف فرمائے۔

اس ریفرنڈم کی اہمیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب عرض کرتا ہوں۔

پہلی اہمیت یہ ہے کہ مارشل لا کے نقطے سے نکل کر قوم کو سول جمہوری اور انتخابی حکومت کے دائرے میں داخل ہوتے کا راستہ مل گیا ہے۔ انتخابات کو مؤخر کرنے کا اندیشہ اب اس وجہ سے نہیں ہے کہ صدر پاکستان کے آئندہ پانچ سالہ صدارت کا آغاز ہی منتخب ایوانوں کے اجلاس سے ہونا ہے۔ یہ واضح طور پر انتخابی گارنٹی ہے۔

دوسری اہمیت یہ ہے کہ اب تک جو کچھ کام ہوا تھا، نہ صرف اس کو عوامی ووٹوں

نے تحفظ فراہم کر دیا ہے بلکہ آئندہ ہونے والے انتخابات اور ان کے نتیجے میں قائم ہونے والی اسمبلیاں، ان سب کو آئینی ضمانت مل گئی ہے۔ اگر ایسی ضمانت کے بغیر انتخابات کرائے جاتے تو کل کوئی بھی شخص عدالت کے سامنے جا کر ان کو چیلنج کر سکتا تھا، پھر اگر یہ سارا عمل خلاف آئین قرار پاتا تو قوم ایک غیر محدود انتھاہ تاریکی میں کھو جاتی۔ ریفرنڈم کے مثبت نتیجے نے ان خطرات کی راہ بند کر دی ہے۔

تیسری اہمیت یہ ہے کہ اس ریفرنڈم نے لادینیت پسندوں اور تخریب پسندوں کے اس محاذ کو شکست دے دی ہے جو موجودہ حکومت کے خلاف تو تھے ہی، ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ آگے کے لیے جمہوریت کی بحالی اور انتخابات کے انعقاد کا راستہ روکا جائے تاکہ نئے مارشل لا کا انعقاد عمل میں آجائے۔ اور پھر وہ اس کی رکاب تھام کر اپنا اُلو سیدھا کر سکیں۔

چوتھی اہمیت یہ کہ نظریہ پاکستان اور نفاذ اسلام کا جو سرمایہ تحریک پاکستان نے قوم کے لیے چھوڑا تھا، اُس میں اسی قوم کے سیکولرسٹ لیڈروں نے یہ کہہ کر کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے تھے کہ پاکستان کا تو مقصدِ وجود محض سیاسی و اقتصادی آزادی تھا، اس کا کوئی تعلق اسلامی قانون و حکومت سے نہ تھا۔ اس کے لیے وہ یہ کہتے رہے کہ قائداعظم کی ۱۱ ر اگست ۱۹۴۷ء والی (دستور ریہ میں) تقریر اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ خود قائداعظم کا منشا لادینی نظام تھا۔ انہیں یہ خیال نہ آیا کہ وہ قائداعظم پہ نہ صرف تناقض کا، بلکہ موقع پرستی کا ناپاک الزام بھی تھوپ رہے ہیں۔ پھر انہوں نے مقبولِ عام نعرے "پاکستان کا مطلب کیا ــــــ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی شانِ نزول یہ بیان کی کہ وہ تو بچوں کا نعرہ تھا۔ اس سرپھرے پن کا جواب اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا کہ نظریۂ پاکستان اور نفاذِ اسلام کے حق میں از سرِ نو بالغ شہریوں کے ووٹ ڈلوا کر دکھا دیا جائے کہ یہ نعرہ آج بھی بزرگوں، نوجوانوں اور خواتین کا دل پسند نعرہ ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۷ء کے قومی رجحانات کو قوم کے ذریعے تازہ کرا کے ایسے حضرات کے سامنے رکھ دیا گیا۔ آج ہر کوئی محسوس کر سکتا ہے کہ اصل بچے خود یہ بزرگ ہیں جنہوں

نے محض فاصلۂ وقت سے فائدہ اٹھا کر خلافِ حقیقت باتیں کیں اور ساری قوم کو بچوں کا انبوہ سمجھ کر انہیں پھسلانا چاہا۔

سچ یہ ہے کہ کمیونسٹوں، لادینیت پسندوں اور تخریب کیشوں کی کمر اس فیصلے سے ٹوٹ گئی ہے۔

پانچویں اہمیت یہ ہے کہ روسی بھارتی لابی اور ان کے جاسوسی نظاموں اور آلہ ہائے کار کے خواب کرچی کرچی ہو گئے ہیں۔ اگر یہ ریفرنڈم نہ ہوتا تو روس اور بھارت دونوں کی خفیہ سرگرمیاں ہمارے ہاں کے آنے والے انتخابات کے خلاف شروع ہو جاتیں (جب کہ بھارت اپنے انتخابات سے فارغ ہو کر نئی قوت کے ساتھ پاکستان پر اپنی پرچھائیں ڈالنے کے لیے مصروف عمل ہو جاتا)۔

چھٹی اہمیت یہ ہے کہ آج ریفرنڈم نے پاکستانی قوت کے اسلامی جذبے اور وحدت کی قوتوں کو مجتمع کر کے پاکستان کو اس قابل کر دیا ہے کہ وہ اپنی داخلی اور خارجہ پالیسیوں کو آگے بڑھانے کے لیے مضبوطی سے کام کر سکے اور دنیا کی ہر قوت کے سامنے اعتماد سے کھڑا ہو سکے۔ نیز سرحدوں پر جو خطرات منڈلا رہے ہیں ان کو بھی اب ملحوظ رکھنا ہو گا کہ سامنے ایک ایسی قوت ہے جسے عوام کے ووٹوں نے اعتماد کی قوت دے چٹان بنا دیا ہے۔

ساتویں اہمیت یہ ہے کہ ریفرنڈم جس سوال پر ہوا ہے اس میں قانونی طور پر دو باتیں طے ہو گئیں۔ اوّل یہ کہ صدر کی ذمہ داری ہے کہ وہ قوانین کو کتاب و سنّت کے سانچے میں ڈھالنے کا کام تیز تر کرے۔ اور دوم یہ کہ انتخابات کا انعقاد کرائے۔ اب اگر صدر اسلامی قانون سازی نہ کرے یا اس میں تاخیر و التوا سے کام لے یا قانون سازی میں کتاب و سنّت کے اسلام سے انحراف کرے تو معاملہ عدالت کے سامنے لے جایا جا سکتا ہے کہ قوم نے ۵ سالہ صدارت جس متعین مقصد کے لیے دی تھی اسے صحیح طور پر پورا نہیں کیا جا رہا۔ اسی طرح اگر انتخابات کے انعقاد کرنے میں بے جا تاخیر ہو (جو بظاہر اس لیے ممکن نہیں کہ صدر کی صدارت کا آغاز ہی انتخابات کے بغیر نہیں ہو سکتا) تو یہ معاملہ بھی عدالت

یوں لے جایا جا سکتا ہے کہ شہریوں نے تو ووٹ جلد انتخابات کرانے کے لیے دیئے ہیں ۔ مارشل لا کے فیصلوں کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا ، مگر اب ریفرنڈم کا سوال ایک عوامی ، سیاسی اور قانونی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس کے مضمرات پر عدالتوں میں بحث ہو سکتی ہے ۔

جذباتی طور پر سوچنے والے حضرات ٹھنڈے دل سے ریفرنڈم کی ان اہمیتوں پر غور کریں ۔ سیاست جذباتی ہیجانات سے نہیں چلا کرتی ، سیاست کے لیے فراست و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے ۔

کچھ لیڈروں اور شہریوں کی مشکل یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ذہنوں کی ساخت ایسی بنالی ہے کہ اور سب کچھ گوارا ہے ، مگر جنرل محمد ضیاء الحق کا وجود کسی طرح گوارا نہیں ہے ۔

میں کہتا ہوں کہ پہلے تو آپ غلام محمد گورنر جنرل ، سکندر مرزا ، صدر ایوب ، یحییٰ خاں ، بھٹو اور مجیب سب کے ساتھ جنرل محمد ضیا الحق کو ایک قطار میں کھڑا کریں اور سب کو ان کے خیالات ، کردار اور کارکردگی کے لحاظ سے نمبر دیں اور پھر بتائیں کہ آپ کس نتیجے تک پہنچتے ہیں ۔

فرض کیجیے کہ جنرل ضیاء الحق کو " ۰ " نمبر دیتے ہیں ۔ اور اس لیے آپ نے ریفرنڈم کی مخالفت کی ہوگی یا بائیکاٹ کیا ہوگا ۔ ذرا یہ فرمایئے کہ اگر ریفرنڈم کا نتیجہ خدانخواستہ اُلٹا ہوتا تو پھر کونسا ابراہیم لنکن یا امیرالمومنین یا آفتابِ تقویٰ سامنے آجاتا ۔ پھر تو صدر ضیاء الحق بوریا بستر لپیٹتے اور کوئی دوسرا جنرل آچکا ہوتا اور وہ اب سے نئے اور نوجوان مارشل لا کو کسی اور ڈھب سے لے کے چلتا جسے سمجھنے اور جس کے ساتھ مناسبت پیدا کرنے سے پہلے جسے "بھگتنا" بھی ہوتا اور ممکن ہے کہ اس پہلو سے تجربہ سابق تجربوں سے زیادہ تلخ ہوتا ۔

اور فرض کیجیے کہ اہل سیاست کو پکارا جاتا کہ صاحبان آیئے اور نظام کو سنبھالیے۔ تب ذرا یہ فرمایئے کہ کیا دس بارہ یا زیادہ سیاسی (نیز دینی) افراد میں سمجھوتہ ہو بھی سکتا تھا؟ (چند سال کے تجربے کو سامنے رکھیے!) اور ہوتا تو کس شخصیت پر ہوتا۔ میں کسی کا نام نہیں لیتا۔ کیونکہ اس سے خواہ مخواہ کا ردِّعمل پیدا ہو سکتا ہے۔ آپ سارے بڑے ناموں کی فہرست بنایئے اور غور کیجیے کہ کس پر سمجھوتہ ہو سکتا تھا۔ اور پھر اس سے آپ کو دینی اور ملکی لحاظ سے کیا ملتا؟

یہ کوئی سیاست نہیں ہے کہ ایک شخص کو آپ میخ بنا کر ذہن میں گاڑ لیں اور یہ کہیں کہ جب تک یہ میخ نہیں نکلتی، نہ ہم انتخاب لڑیں گے اور نہ قوم یا ووٹروں کے کسی فیصلے کو قبول کریں گے۔ بائیکاٹ کسی خاص موقع پر کسی جلسے یا تقریب یا کانفرنس کا ہو سکتا ہے، لیکن اگر خود بائیکاٹ ہی ایک مسلک بن جائے تو پھر آپ سیاست کا کوچہ چھوڑ کر کوئی دوسرا بازار ڈھونڈیئے۔ بائیکاٹ منفی راستہ ہے، سیاست میں منفی راستے پر زیادہ دور تک نہیں چلا جا سکتا۔ منفیت دوسروں کو تو ختم کرے یا نہیں، خود اپنی قوتوں کو چاٹ جاتی ہے۔

کیا رحم طلب ہیں وہ سیاسی شخصیتیں اور گروہ جو ریفرنڈم سے پہلے بھی دل کا غبار نکالتے رہے اور جب اُن کے روکے ریفرنڈم کی گاڑی نہ رُکی تو انہوں نے سانپ کے نکل جانے کے بعد لکیر کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اخباروں کے کالموں اور نجی گفتگوؤں اور اخباری بیانوں میں ـــــ یہاں سے لے کر بی بی سی، آکاش وانی اور ماسکو ریڈیو تک ـــــ تابجا لکیر کو پیٹا جا رہا ہے۔ جو حضرات پولنگ اسٹیشنوں پر اُلّو بولنے کی پیش گوئی کر رہے تھے، انہوں نے جب سیکڑوں جگہ پاکستانی شاہبازوں کی صفیریں سُنیں تو ان کے اپنے دل و دماغ میں اُلّو بولنے لگا۔ آج کوئی کہتا ہے کہ پولنگ ۱۵، ۲۰ ٪ ہوئی اور کسی کا الہام بتاتا ہے کہ ۵ ٪ ہوئی۔ دوسرا بتاتا ہے کہ جعلی ووٹ بے تحاشا بھگتائے گئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ ریفرنڈم کو ناکام بنانا چاہتے تھے تو شہری ذمہ داریوں کے

تحت جرأت کر سکے آپ نے اپنے لوگوں سمیت جا کر "نہیں" کا ووٹ کیوں نہ ڈالا؟ اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا۔

آج جو لوگ بہر مجبور کرکے ریفرنڈم کے مثبت نتیجے کے دودھ میں مینگنیاں ڈال رہے ہیں، انہیں اس شغل فضول کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نیک کام کرنا چاہیے۔

یہ طریقہ ملک کے سیاسی مزاج کو بگاڑنے والا ہے کہ پہلے آپ یہ زور لگائیں کہ ریفرنڈم نہ کرایا جائے۔ پھر آپ بائیکاٹ کرکے پولنگ اسٹیشنوں پر الّو بولوانا چاہیں، پھر جب سب کچھ ہو جائے تو فرمائیں کہ ہم نہیں مانتے۔

"میں نہ مانوں" کا اگر یہی طور سیاست کی ادا ٹھہرے تو جو کام آپ کرنا چاہیں اور اپنے گروہوں کو جن مقاصد سے بلائیں اور پبلک سے جو اپیل کریں اس پر متعلقہ لوگ "میں نہ مانوں" کہہ کر سامان انتشار کیوں نہ کریں؟ "میں نہ مانوں" کا راستہ انتشار کا راستہ ہے۔ آخر معاملات کو کسی نہ کسی طریقے سے، کسی نہ کسی نقطے پر آکر ختم ہونا ہوتا ہے۔ جس ملک و قوم میں نزاعات کا کوئی اختتام نہ ہو، اس کے مقدر میں خرابی کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔

اب پیچھے پلٹنے یا بیٹھ رہنے کے بجائے اگلے مرحلے پر سوچ بچار کرنی چاہیے۔ اگلا مرحلہ انتخابات کا ہے۔

کچھ لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے طے کر رکھا ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں اگر انتخابات ہوں تو وہ ان میں شریک نہیں ہوں گے۔ ان کا طرز فکر ایسا ہی ہے جیسی ہمارے دیہی علاقوں میں ہوتا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ میں خدائے وحدہ لاشریک کو مانتا ہوں، لیکن اگر فلاں شخص کہے کہ خدا ایک ہے تو میں اس کی بات نہیں مانوں گا۔ نعوذ باللہ۔ بس ان فوق السیاست مدبرین کو چھوڑیے۔ ہمارے اصل مخاطب معتدل مزاجوں اور متوازن دماغوں سے آراستہ شہری ہیں۔

جنرل ضیاء الحق نے انتخابات کے سلسلے میں میاں طفیل محمد صاحب کی پیش کردہ شرائط پر جو وضاحتیں اور یقین دہانیاں دوران ملاقات کرائی تھیں اور پھر جن کو پریس اور اسٹیج کے ذریعے بھی عوام کے سامنے رکھ دیا، ان کے متعلق مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ وہ اپنے ایک ایک لفظ کا پاس کریں گے، اور نہ کریں گے تو پھر ہم کو معلوم ہے کہ ہمارا فرض کیا ہے اور اسے ہمیں کس اسلوب سے ادا کرنا ہے۔ لیکن بلاوجہ مخالفانہ پیش قیاسیاں کرنے کی وجہ سے فضا خراب ہوتی ہے۔

اب اگر دستور ۱۹۷۳ء کو برقرار رکھ کر معقول طریق سے انتخابات کر دیے جاتے ہیں اور پارلیمان کو بااختیار ادارہ بنایا جاتا ہے، وزیراعظم کو بااختیار حیثیت دی جاتی ہے، نیز صوبوں کے طے شدہ حقوق و اختیارات کو برقرار رکھا جاتا ہے اور مزید یہ کہ قرارداد مقاصد کو دستور کے دیباچے کے بجائے اس کا عملی حصہ بنا کر قوانین اسلام کے اجرا اور اسلامی اداروں کے قیام اور ان کے نشوونما اور پالیسیوں کو اسلامی اُصول و مقاصد کے مطابق ڈھالنے کے تیز رفتار کام کی یقین دہانی کرائی جاتی ہے تو پہلے سے شکوک و شبہات سے بات کا آغاز نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ متذکرہ اعلانات و مواعید کو خوش آئند قرار دے کر عوام کو متحرک کرنا چاہیے۔

خاص طور پر جن لوگوں کو جمہوریت کی بحالی کے سابقہ دین کے لیے کام کرنا ہے، ان کو پیش آمدہ فرصت کے لیے آج سے عملی سرگرمی کی راہ پر گامزن ہو جانا چاہیے، بلکہ صحیح الفکر وہ لوگ نکلے جنہوں نے ریفرنڈم میں پبلک اور پولنگ کے عملے کے درمیان کام کر کے انتخابات کی راہ پر قدم آگے بڑھا دیا۔[1]

---

[1] میرے سے یہ تصور ہی غلط تھا کہ ریفرنڈم میں جو کارکن ووٹروں کو صحیح تلقین کریں، یا ان کی رہنمائی اور مدد کریں، یا پولنگ اسٹیشنوں پر کام کریں وہ ضیاء الحق کے کارکن بن گئے۔ (وہی بات کہ بعض ذہنوں میں ضیاء الحق بیخ بن کر گڑا ہوا ہے) جی نہیں، (باقی بر صفحہ آئندہ)

(باقی بر صفحہ آئندہ)

ایمن و ذہین قسم کے لیڈروں اور شہریوں کی خواہش اور کوشش یہی ہونی چاہیے کہ انتخابات اس اعلان شدہ نقشے کے مطابق منعقد ہوں جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔

مگر فرض کیجیے جو معیاری تصور آپ کا ہے اس میں کوئی کسر رہ جائے تو یہ سوال جواب مانگتا ہے کہ پھر کیا کیا جائے۔ اس کا ایک آسان جواب تو ہے کہ مخالفت (بلا تصادم) کے ساتھ بائیکاٹ۔ مگر یہ جواب درست نہیں ہے۔

اگر برسرِ اقتدار قوت اپنی بات سے انحراف کرے یا شہریوں کی خواہشات یا اسلامی اور جمہوری روایات سے رُوگردانی کرے تو سخت اعتراض بھی کیجیے اور غلط روش کے خلاف احتجاج کی آواز بھی اُٹھائیے۔ (اگر ممکن ہو!) لیکن ایسا بائیکاٹ بہت بے معنی ہے جو کسی فرد یا گروہ کے سیاسی اقدام کو برسوں کے لیے معطل کر دے، یہاں تک کہ اس کا سیاسی شعور اور سیاسی مزاج ہی دم توڑ دے۔

سیاست کا ایک اُصول یہ ہے کہ سیاست کاری کسی درپیش صورت حال GIVEN CIRCUMSTANCES کو موجود مان کر اپنے عمل کو جاری رکھنے کا نام ہے۔ فرض کیجیے کہ مسافرِ سیاست کے سامنے ایک طویل و عریض جنگل آجاتا ہے اور وہ اُسے دیکھ کر کہتا ہے کہ جب تک یہ جنگل کٹے گا نہیں اور صاف ہموار میدان نہ بن جائے گا، میں قدم آگے نہ بڑھاؤں گا۔ پھر وہ اطمینان سے کھیت میں اپنا کیمپ لگا لیتا ہے۔ یہ سیاسی طرزِ عمل نہیں ہے۔ سیاسی طرزِ عمل یہ ہے کہ اگر جنگل سامنے آجائے تو ہمیں اس میں سے اپنا راستہ نکالنا ہے، کسی بیل کو نوچ کر، کسی شاخ کو توڑ کر، کسی جھاڑی کو الانگ کر، کسی نالے پر پڑی سی سوکھی لکڑی سے پل بنا کر، سیدھا نہیں تو ذرا اِدھر اُدھر گھوم کر ہجوم کر کے نہیں تو ایک قطار بنا کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

وہ اپنے مقصد کے کارکن بنے اور انہوں نے اپنے مقصد کے لیے انتخابی راستے میں پیش قدمی کی۔ جنہوں نے کوتاہی کی، اب جب وہ یکایک اپنے لیے ووٹ مانگنے جائیں گے تو اُن کو خود محسوس ہو جائے گا کہ انہوں نے ریفرنڈم کے مرحلے کا کام نہ کر کے اپنا نقصان کیا۔

جنگل کا سینہ چیر جاتا ہے۔

یہی اصول تھا جس کے تحت خان لیاقت علی خاں مرحوم کے دور کے اُن انتخابات میں ہم نے حصّہ لیا جن میں سرکاری ملازمین پہلی بار زور شور سے استعمال ہوئے اور دھن، دھونس اور دھاندلی کے مختلف طریقے استعمال کیے گئے۔ پھر ایوب خاں صاحب کی بنیادی جمہوریت جس کی شدید مخالفت مولانا مودودیؒ اور ان کے متاثرین نے کی، (اور اس دَور میں زیادتیاں بھی برداشت کیں) اسی کے تحت ہونے والے انتخابات میں مولانا مودودیؒ کی رضامندی (بلکہ تقاضے سے) بہت سے محبانِ دین و جمہوریت نے پوری طرح حصّہ لیا[1] جن میں سے ایک مَیں بھی تھا۔ پھر یحییٰ خان کے مارشل لا کے تحت اور بعد ازاں بھٹو آمریت کے تحت ہونے والے انتخابات میں بھی ہم شریک ہوئے۔ بعد ازاں موجودہ مارشل لا کے تحت بلدیاتی انتخابات میں بھی ہمارے دوست بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور بہت سے کامیاب ہوئے۔

یہ سب کچھ اگر جائز تھا، تو آج جو انتخابات درپیش ہیں، ان میں اگر کوئی کمی بیشی رہتی بھی ہے تو اس کے باوجود ہمیں تو یہ سوچنا چاہیے کہ ہم کس طرح اپنا راستہ بنا کر نقشۂ سیاست میں بہتر تبدیلی کی کوشش کر سکتے ہیں اور غلبۂ دین کے لیے کس حد تک اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

---

(۲)

کوئی بھی اجتماعیت اس حقیقت کو نظر انداز کر کے قائم نہیں کی جا سکتی، چاہے وہ مسجد کمیٹی ہو یا پارلیمنٹ، یا ریاست کہ افرادِ انسانی میں مختلف مسائل و معاملات کے

---

[1] صدارتی الیکشن ہوا تو اس میں بھی ہم نے حصّہ لیا۔

بارے میں اختلاف ضرور ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہر معقول اجتماعیت وہ طریقہ بھی متعین کرتی ہے جس کے تحت تمام اختلافات کسی ایک خط پر آ کر ختم ہو جاتے ہیں، یا اگر عقلی حد تک رہیں بھی تو وہ عملی کام میں حائل نہیں ہوتے۔

اسلامی اجتماعیت نے اختلافات کے بارے میں یہ طریقہ وضع کیا ہے۔

اوّلین معیارِ فیصلہ چونکہ یہاں الکتاب اور الرسول ہے، اس وجہ سے جو امور صراحتہً کتاب و سنّت کے نصوص سے ثابت ہوں، ان میں کسی کو اختلاف کرنے کا حق نہیں۔ ایسے معاملات میں صرف آمنا وصدقنا کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ منصوص معاملات و مسائل میں اگر راہیں الگ الگ ہو جائیں اور ہر شخص کی تقسیم حلال و حرام اور تمیز جائز و ناجائز جدا جدا ہو تو کسی اجتماعیت کے قائم رہنے یا چلنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہاں، نصوص کی تعبیرات اور ان کے انطباقات میں نقطۂ ہائے نظر کا فرق ہو سکتا ہے۔ یہ فرق اہلِ علم سلف کے قابلِ احترام و اعتماد مفسرین و محدثین اور فقہا کی تحقیقات کی مدد سے بہ دلائل واضح کر کے نقطۂ اتفاق پیدا کر سکتے ہیں۔ بیشتر معاملات میں اجماع اور قرونِ اولیٰ سے اب تک کا یکساں تعاملِ اُمت فیصلہ کن ہوتا ہے۔ پھر بھی اگر تعبیر و تاویل کے جزئی اختلافات رہیں تو وہ اگلی قسم کے مسائل کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔

اسلامی اجتماعیت کا اصل دائرۂ اختلاف تدابیر و مصالح سے تعلق رکھتا ہے۔ کب کیا بات کہی جائے؟ کیا اقدام مناسب ہوگا؟ کس رویے میں دین کی خیرخواہی اور ملّت کی بہبود یا انسانیت کی فلاح ہے؟ کس صورت میں تحریک اسلامی کا چہرہ زیادہ روشن ہو سکتا ہے؟ کس رُخ پر چلنے سے دعوتِ حق کی راہیں کھلتی اور آسان ہوتی ہیں؟ کس چیلنج کا کیا جواب دینا مناسب ہوگا؟ کس شخص یا گروہ کے بارے میں کیا رائے رکھی اور بیان کی جائے؟ الجھنوں کے جنگل میں سے کیسے راستہ بنانا مناسب ہوگا؟ کس شکل میں اجتماعیت کی زیادہ قوت مجتمع ہو سکتی ہے اور وحدت کی صف مضبوط ہو سکتی ہے وغیرہ

اختلافی اُمور کی اسی دوسری صنف میں تعبیرِ نصوص یا انطباقاتِ احکام کا ہر وہ معاملہ بھی داخل ہو جائے گا جس کا حل اجماع یا تعاملِ اُمت یا علمائے سلف کی کاوشوں سے نہ ہو سکے۔ اس ذیل کے اختلافی اُمور کے لیے اُصولِ مشاورت مقرر کیا گیا ہے جس کے بعد اور کوئی طریقۂ حلِ اختلافات موجود نہیں ہے۔ یہاں آکر تمام بحثوں کو ختم ہو جانا چاہیے۔

اسلامی مشاورت کے اساسی ضوابط حسب ذیل ہیں:

۱- اہم مسائل و معاملات کو اُولی الامر (ارباب مشاورت اور صاحب امر) کے حوالے کرنا چاہیے۔ یعنی پہلے سے اس پر ایسی کھلی بحثیں ہونی چاہئیں کہ مختلف افراد اور گروہوں کے اندر حتمی آرا تشکیل پا جائیں، نہ کسی ایک یا دوسرے نقطۂ نظر پہ گروپ یا جتھے بن جانے چاہئیں، بلکہ گفتگوئیں محض مسئلے کو سمجھنے کے لیے ہوں اور کوئی آدمی کسی خاص رائے کو نہ تو حتمی فیصلے کے طور پر پیش کرے، نہ ایسے فیصلے کے حق میں بخوبی CONVESSING کر کے فضا ہموار کرے اور نہ ہم خیالوں کا جتھا بنائے۔

۲- جس سطح پر رائے طلب کی جائے، وہاں ہر شخص دیانت داری سے اپنی رائے دے (بلاخوف لومۃ لائم) کیونکہ کسی شخص کے اندر جو رائے بھی مفادِ دین اور مصلحتِ مسلمین اور خیر خواہیٔ انسانیت کے لیے پیدا ہو وہ ایک امانت ہے جو دیانت داری سے ادا کرنی چاہیے۔ اپنی رائے کے حق میں پورے دلائل دیے جائیں۔ امکانی اعتراضات اور مقابل کے شبہات کے بارے میں وضاحتیں کی جائیں۔ پھر جب آدمی یہ حق ادا کرلے تو وہ اپنی بڑی ذمہ داری سے فارغ ہوا۔ اب یہ کام متعلقہ فرد، افراد یا مجلس کا ہے کہ وہ کشادہ دلی سے غور کریں اور استفادہ کریں۔

۳- کسی شخص کو اپنے متعلق عقلِ کل ہونے کا ادعا اور دوسروں کے مقابلے میں ذہنی برتری کا احساس لاحق نہیں ہونا چاہیے کہ بس جو کچھ میں نے کہا ہے اُسے ضرور مانا جانا چاہیے۔ دوسروں کو بھی حسنِ نیت سے آراستہ سمجھنا چاہیے اور تسلیم کرنا چاہیے کہ دوسرے

بھی سوچتے ہیں، دوسروں کے اندر بھی اپنی اپنی آراء اُبھرتی ہیں، دوسروں کے دلائل بھی قابلِ توجہ ہوتے ہیں۔ اور دوسروں سے بھی استفادہ کیا جانا چاہیے۔

۴۔ پھر جب ہر طرف سے آراء سامنے آچکیں تو کسی دینی مشاورتی مجلس کی فضا جو رنگ اختیار کرے اور ساری مجلس یا اس کی واضح اکثریت جب کسی فیصلے پہ پہنچ جائے تو اجتماعی نقطۂ نظر کو اس کشادہ دلی سے قبول کر لینا چاہیے کہ جیسے وہ بھی اپنا ہی فیصلہ ہو۔ ذہن میں اگر کوئی اختلافی رجحان باقی بھی رہے تو اُسے اجتماعیت پر قربان کر دینا چاہیے۔ علی الخصوص جب سربراہِ کار کی رائے بھی اکثریتی رجحان کے حق میں دو ٹوک طریق سے سامنے آجائے تو پھر سمع و طاعت اور ہم آہنگی کی ذمہ داری اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔

اسلامی اُصولِ مشاورت کے تحت کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اجتماعی فیصلہ ہو جانے کے بعد پھر اپنی جداگانہ اختلافی رائے کا جھنڈا بلند کرے بلکہ یہ بھی درست نہیں کہ اس کے الفاظ یا رویے سے کسی طرح کے تکدر اور بددلی کا اظہار ہو۔

یہ ہے طریقہ تفردات کے فتنے سے بچ کر اجتماعیت کو مستحکم رکھنے کا۔ اگر حلِ اختلافات کے لیے ایسی کوئی آخری حد معین نہ کی جائے تو پھر آدمی کی اختلاف پسند فطرت نہ کسی اتحاد کو قائم رہنے دیتی ہے، نہ کسی اجتماعیت کو چلنے دیتی ہے۔

یہی تمام مخلص خادمانِ دین کی روش رہی ہے، یہی اسلامی نظامِ جماعت کے دستور کا تقاضا ہے۔ اور یہی ۳۴ سال سے ہماری اٹل روایت رہی ہے۔

اس اصول و روایت میں خلل ڈالنے کے معنی یہ ہیں کہ ہزاروں افراد کی قربانیوں سے اسلامیت کے قلعے کی جو فصیل اُٹھائی گئی تھی، اس میں دراڑیں ڈال دی جائیں، اور ساتھ اپنی بنی بنائی ساکھ کو برباد کر دیا جائے۔ محض اپنی "انا" کے سامنے اتنا قیمتی چڑھاوا پیش کر دینا کوئی اچھی بات نہیں۔

یہ محض خود ساختہ مصلحتی باتیں نہیں ہیں، بلکہ معاملے کے ہر پہلو پہ الگ الگ دلائل

کتاب وسنّت میں موجود ہیں۔ ان سارے دلائل کو جو شاید بیشتر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں، میں یہاں دوہرانا نہیں چاہتا۔ لیکن اسلامی نظامِ سمع و طاعت کے متعلق متعدد ہم معنی احادیث میں سے صرف ایک کو یہاں نقل کرتا ہوں:

عن جُنادۃ بن ابی امیہ، قال: دخلنا علی عُبادۃ بن صامت وھُوَ مریضٌ، فقلنا حدِّثنا اَصلحکَ اللہ بحدیثٍ یَنفع اللہ بہٖ سمعتَہٗ مِنْ رَسُولِ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم، قال: دعانا رسولُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعنا، فکان فیما اَخذ علینا اَن بایَعْنا علی السمع والطاعۃ فی مَنشطِنا ومَکرھِنا وعُسرِنا ویُسرِنا واَثرۃٍ علینا، ولا نُنازِعُ الامرَ اھلَہٗ، قالَ اِلاَّ اَن تَروا کفرًا بواحًا عِندکُم مِنَ اللہِ فیہ بُرھانٌ (مسلم)

ترجمہ: "روایت جنادہ بن امیہ کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم عبادہ بن صامت کے پاس گئے جو حالتِ مرض میں تھے، پھر ان سے ہم نے کہا کہ اللہ آپ کو شفا دے، ہم سے کوئی حدیث بیان کیجیے۔ جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہو اور اللہ اسے باعثِ افادہ بنا دے۔ انہوں نے (جواباً) کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں (بیعت کرنے کے لیے) فرمایا اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے جو اقرار لیا اور جس پر ہم نے بیعت کی وہ یہ بات تھی کہ ہم سمع و طاعت کے پابند رہیں، پسندیدہ صورتوں میں بھی اور ناپسندیدہ صورتوں میں بھی، آسانی کی حالت میں بھی اور تنگی کی حالت میں بھی ــــ اور اس صورت میں بھی کہ ہم دباؤ میں ہوں، اور یہ کہ ہم اختیار کے معاملے میں اہلِ اختیار سے نزاع نہ کریں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اضافہ فرمایا کہ " اِلاَّ یہ کہ تم صریح و نمایاں کفر کے صدور کو دیکھو، جس کے متعلق تمہارے پاس اللہ کی طرف سے واضح دلیل موجود ہو۔"

اِس حدیث کو پڑھ کر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ کسی صحیح دینی اجتماعیت کا معاملہ

عام سیاسی پارٹیوں کی طرح کا نہیں ہوتا، جو چیز چاہی مان لی، جس معاملے میں چاہا اختلاف کر کے الگ بیٹھ رہے، دوسروں میں اپنا اختلافی نقطۂ نظر پھیلانا شروع کر دیا، بات کو پریس میں لاکر "المجالس بالامانۃ" کی تعلیم کو پامال کر دیا۔ دینی اجتماعیت کے نظامِ امر اور نظامِ مشاورت اور حدودِ اختلاف کی خلاف ورزی گناہ ہے جس کے سرزد ہونے کے بعد توبہ کے علاوہ کوئی راہ نجات نہیں۔

اس حدیث (اور ایسی متعدد احادیث) کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی فیصلوں اور اربابِ امر کے احکام کی اطاعت خوشگواری اور ناخوشگواری، آسانی اور تنگی کی مختلف حالتوں میں کی جائے گی، بلکہ آدمی جب محسوس کرتا ہو کہ اس کی پرخلوص رائے اور اس کا محکم استدلال دوسروں کی کثرت رائے یا صاحبِ امر کے نقطۂ نظر کے بوجھ سے دَب گیا ہے، تب بھی اُسے اطاعت کرنی چاہیے ـــ اور ایسا نہیں ہونے دینا چاہیے کہ اس کے رویے، اس کے الفاظ، اس کے لہجے یا چہرے کے رنگ سے بھی دیکھنے والوں کو یہ تاثر ہو کہ اس شخص کو اجتماعی فیصلے یا صاحبِ امر کے حکم سے کوئی تکدر ہے۔

دوسری اہم بات اس میں یہ ہے کہ اہلِ امر سے اختیار چھیننے یا اس اختیار کو کمزور کرنے یا اسے کم اثر بنانے کے لیے بحثا بحثی اور شدتِ اختلاف اور اظہارِ رنج اور جتھا بندی کے ذریعے شمہ بھر بھی کوشش نہ کی جائے۔ جو لوگ شریک مشورت ہوتے ہیں وہ بھی "امر" سے ایک گونہ تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا ان کی اکثریت کے رجحان کو بے وزن اور ناقابلِ احترام قرار دینا بھی تنزاع کی تعریف میں داخل ہے۔ اور سربراہ جو کسی اسلامی نظامِ جماعت کو چلانے کی آخری ذمہ داری رکھتا ہے اور پوری جماعت کے سامنے سب سے بڑھ کر جواب دہ ہوتا ہے۔ وہ جب رفقائے مشورت کی بحثیں سُن کر ان کے غالب رجحان کی بنیاد پر ایک فیصلہ دیتا ہے کہ یہ بات یوں طے ہوئی تو اس بات کو نہ ماننا یا زبان سے مان کر عمل سے اس کا حق ادا نہ کرنا، یا مثبت سرگرمی کے بجائے منفی انداز سے ذہنی برودت کا مظاہرہ کرنا۔ یہ ساری صورتیں تنزاع فی الامر کا شائبہ رکھتی ہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ حدیث کی رُو سے بگڑ جانے یا تبرّی کرنے یا مختلف رائے سامنے لانے کے لیے صرف ایک ہی حتمی بنیاد ہے، اور وہ یہ کہ کھلے کھلے کفر کا صدور اصحاب امر یا ارباب مشورت کی طرف سے ہو، اور کھلے کھلے کفر کا اطلاق محض جذبات کی بنیاد پر نہ کیا جائے۔ بلکہ آدمی کے پاس اللہ کی طرف سے صاف صریح دلیل ہونی چاہیے۔

یہ ہے کسی اسلامی نظام جماعت میں طاعت کی آخری حد۔ اگر لوگ اس آخری حد کے آنے سے پہلے ہی ہر اختلاف پر اِدھر اُدھر منہ پھیر لیں تو نتیجہ سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ ایک تیز رَو ندی جو چٹانوں کو ریلتی جاتی ہو، کئی دھاروں میں تقسیم ہو جائے اور چھوٹے چھوٹے دھارے اس قابل بھی نہ ہوں کہ راستے میں جمع ہو جانے والے انبارِ خس و خاشاک کو بہا لے جا سکیں۔ وہی ندی جسے عبور کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اب اس کے چھوٹے چھوٹے دھاروں اور باریک باریک نالیوں کو بچے بھی الانگنے لگیں گے۔ اختلاف جب اپنی حدود کا پابند نہ رہے تو پھر اجتماعیت کا قائم رہنا ممکن نہیں رہتا۔ سمع و طاعت کے دینی اُصولوں اور دیرینہ عملی روایات کو اگر توڑا جانے لگے تو پھر کسی فرد کی بھی سربراہی اور کسی مجلس کی مشاورت کی قوت کام نہ کر سکے گی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم شریعت کے نظامِ سمع و طاعت، اس کے ضابطۂ مشاورت اور اہلِ امر کے حقوق کو اچھی طرح سمجھیں اور ان کو قدم قدم پہ ملحوظ رکھیں۔